© rasailojaraid.com

تاثرات

مولانا عبداللہ فیصل آبادی مرحوم

پنجاب کے شہر فیصل آباد (سابق لائل پور) کے ایک درویش منش مگر جید عالم دین مولانا عبداللہ نے ۱۵ جولائی ۱۹۸۳ (۴ شوال ۱۴۰۳ھ) کو جدہ (سعودی عرب) میں وفات پائی اور ۱۷ جولائی کے پاکستانی اخبارات میں یہ خبر چھپی، جس سے بے حد صدمہ ہوا۔ وہ "المعارف" کے مستقل قاری، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کی تصنیفی و علمی خدمات کے مداح اور ارکانِ ادارہ سے پرخلوص تعلق رکھتے تھے۔ افسوس ہے بزمِ المعارف میں ان پر اظہارِ افسوس میں تاخیر ہوئی۔ آج گیارہ مہینے بعد ان کی صف ماتم بچھائی جا رہی ہے۔

مولانا مرحوم علوم متداولہ میں عمیق نگاہ رکھتے تھے اور تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، عربی ادبیات اور باقی مروجہ فنون میں ان کو دسترس حاصل تھی۔ ان میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کا عمل ان کے علم سے ہم آہنگ تھا اور تصوف و معرفت کی رسم و راہ سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی موت ایک عام آدمی کی موت نہیں ہے اور نہ ان پر اظہارِ حزن و ملال کا معاملہ وقتی اور ہنگامی ہے۔ یہ سب کا افسوس ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے ایک ایسی شخصیت کو چھینا ہے جو بعض اعتبارات سے ہمارے لیے بہت موقر اور محترم تھی۔

مولانا عبداللہ کے والد کا نام حاجی عنایت اللہ تھا۔ یہ اپنے علاقے کے ایک نیک آدمی تھے اور ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری کے ایک گاؤں "نشان" میں سکونت پذیر تھے۔ ان کے گھر کئی بچے پیدا ہوئے، لیکن کوئی زندہ نہ رہا۔ اس نواح کے ایک گاؤں اوڈانوالہ چک ۲۹۵ گ ب میں ایک بزرگ صوفی عبداللہ اقامت گزیں تھے جو بڑے متدین اور متقی آدمی تھے اور جماعت مجاہدین سے منسلک تھے[1]۔ حاجی عنایت اللہ کا شمار صوفی صاحب کے عقیدت مندوں

---

[1] صوفی عبداللہ مرحوم دراصل وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ) کے رہنے والے تھے۔ اوائل عمری میں سرحد پار کی جماعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہوتا تھا۔ انھوں نے صوفی صاحب سے دعا کی درخواست کی کہ اللہ انھیں بیٹا عطا فرمائے جو باعمل عالم بنے اور لوگ اس سے مستفید ہوں۔ صوفی صاحب نے بارگاہِ خداوندی میں ہاتھ اٹھائے اور عجز و عاجزی سے دعا کی جو اللہ نے قبول فرمائی اور حاجی عنایت اللہ کو بیٹا عطا کیا، جس کا نام صوفی صاحب کے نام پر عبداللہ رکھا گیا۔ یہ ۱۹۱۴ء کی بات ہے۔ یہ واقعہ مولانا عبداللہ نے ایک مرتبہ خود بیان فرمایا اور کہا کہ "میں صوفی عبداللہ صاحب کی دعا کا نتیجہ ہوں۔"

مولانا کی ولادت سے کچھ عرصہ بعد ان کا خاندان موضع لشارن سے نقل مکانی کر کے قریب کے ایک گاؤں چک ۴۵۱ گ ب میں چلا گیا تھا، مولانا کی ابتدائی تربیت اور نشو و نما اسی گاؤں میں ہوئی۔ ان کے والدین اور خاندان کے دیگر لوگ دین داری اور نیکی میں تو اپنا ایک مقام رکھتے تھے لیکن ان میں کوئی شخص راہِ علم سے آشنا نہ تھا۔ مولانا کے والد اصحاب علم کی مجلسوں اور اربابِ تصوف کی محفلوں میں حاضر ہوتے تھے، اس لیے ان کے دل میں بیٹے کو تعلیم دلانے اور علم و فضل کے زیور سے آراستہ کرنے کا جذبہ ابھرا اور قریب کے ایک مکتب میں داخل کرا دیا چنانچہ ابتدائی کتب میں انھوں نے اسی علاقے کے اہلِ علم سے پڑھیں۔ مولانا کو خود بھی حصولِ علم کا شوق تھا، والدین بھی یہی چاہتے تھے اور ذہن بھی رسا پایا تھا، اس لیے یہ منزل جلد ہی طے ہو گئی۔

اب متوسط اور انتہائی درجے کی کتابیں پڑھنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ اس کے لیے انھوں نے دہلی کا رُخ کیا

مجاہدین سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کئی قسم کی مصیبتیں اور تکلیفیں برداشت کیں۔ ۱۹۳۳ء میں اوڈانوالہ (ضلع فیصل آباد) میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا۔ حاجی عنایت اللہ پہلے آدمی ہیں، جنھوں نے اس مدرسے کی امداد کے لیے گھی کا ایک کنستر اور آٹے کی ایک بوری صوفی صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ یہ مدرسہ صوفی صاحب کی یادگار کے طور پر اگرچہ اوڈانوالہ میں بھی قائم ہے لیکن مرکزی حیثیت سے ماموں کانجن میں منتقل ہو گیا ہے اور "دارالعلوم تعلیم الاسلام" کے نام سے قائم ہے۔ تین سو کے قریب طلبا اس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بیس بائیس اساتذہ خدمتِ تدریس انجام دے رہے ہیں۔ دارالعلوم کی بہت بڑی عمارت اور لائبریری ہے۔ صوفی صاحب مرحوم مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ ہر مسلکِ فقہی کے لوگ ان کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں شامل اور ان کو لائقِ احترام گردانتے تھے۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے لیکن بہت معاملہ فہم اور متوازن اور معتدل تھے۔ ہمیشہ علم اور اصحابِ علم کی خدمت میں مشغول رہے۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔ ۲۸ اپریل ۱۹۷۵ء (۱۳ ربیع الثانی ۱۳۹۵ھ) کو فوت ہوئے اور اپنے قائم کردہ دارالعلوم (ماموں کانجن) کے احاطے میں دفن کیے گئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور مولانا عبدالوہاب دہلوی کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے۔ ان سے بعد ان کے فرزند گرامی مولانا عبدالستار دہلوی سے کتب حدیث کی تکمیل کی۔ باقی فنونِ درسیہ بھی ممتاز اہل علم سے پڑھے۔

مروجہ علوم سے فراغت کے بعد واپس آئے تو اوکاڑہ کے قریب چک ۱۲ میں اقامت اختیار کی۔ وہاں خطابت و امامت اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ کافی عرصہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

مولانا مسعود عالم ندوی (متوفی ۱۶- مارچ ۱۹۵۴) عربی کے مشہور ادیب، مصنف اور مترجم تھے۔ عربی زبان کی نشر و اشاعت کے لیے انھوں نے "دار العروبہ" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے کچھ عرصہ بعد وہ گوجرانوالہ میں مقیم رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا عبداللہ بھی ان کے حلقے میں آئے اور ان سے جدید عربی میں استفادہ کیا۔ گوجرانوالہ کے دورانِ قیام میں وہ نامور عالم حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی کے درسِ بخاری میں بھی شریک ہوتے رہے۔

اب تقریباً بائیس برس سے فیصل آباد میں مقیم تھے اور ستیانہ روڈ پر جیلانی پورہ کی گلی ۱ میں مسجد کریمیہ میں فرائض خطابت انجام دیتے تھے، مسجد کے قریب ہی ان کا ذاتی مکان تھا، جس میں ان کی رہائش تھی۔ ادارہ علومِ اثریہ میں جو فیصل آباد کے منٹگمری بازار میں قائم ہے، شیخ الحدیث کے منصب پر فائز تھے۔

ان سطور کے راقم نے پہلی دفعہ ۱۹۵۰ء میں ان کا نام سنا۔ مارچ کا مہینہ تھا۔ مولانا معین الدین لکھوی نے اپنی درس گاہ جامعہ محمدیہ (اوکاڑہ) کا سالانہ جلسہ منعقد کیا، مولانا محمد حنیف ندوی اور راقم الحروف کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی۔ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ان دنوں اوکاڑہ میں اقامت پذیر تھے، وہاں پہنچے تو شاہ صاحب نے ہمیں چائے پر بلایا۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں سے چند میل کے فاصلے پر چک ۱۲ ہے، وہاں ایک شخص مولانا عبداللہ رہتے ہیں، مسلکاً اہل حدیث ہیں، بہت بڑے عالم اور کثیر المطالعہ شخص ہیں۔ ان کا کتب خانہ بہت سی نایاب اور نادر کتابوں پر مشتمل ہے۔ نہایت ملنسار اور زندہ دل آدمی ہیں۔ میرے گہرے اور مخلص دوست ہیں۔ میں کبھی ان کے ہاں جاتا ہوں، وہ کبھی میرے ہاں آتے ہیں۔ تقریروں اور جلسوں سے انھیں کوئی سروکار نہیں، بس علم اور اہل علم سے واسطہ رکھتے ہیں۔ سادہ مزاج، بے تکلف، وضع قطع اور لباس و معاشرت خالص دیہاتی۔!

اس سے چھ مہینے بعد ستمبر ۱۹۵۰ء میں "الاعتصام" میں اشاعت کے لیے ایک مضمون آیا، جس کا عنوان تھا "فیض الباری کے دو مقام" یہ انھی مولانا عبداللہ کا مضمون تھا، جس پر "ابو محمد عبداللہ لائل پوری، چک ۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بواسطہ رینالہ خورد تحصیل اوکاڑہ" مرقوم تھا۔ میں نے مضمون مولانا محمد حنیف ندوی کو دکھایا۔ انھوں نے پڑھ کر فرمایا:

"مضمون اگرچہ مختصر ہے تاہم بہت اچھا ہے اور معلوم ہوتا ہے، رجال حدیث پر اس شخص کی نظر بہت گہری ہے"۔

یہ مضمون ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۰ کے "الاعتصام" میں شائع ہوا۔

اس سے ٹھیک دو سال بعد نومبر ۱۹۵۲ میں ایک صاحب دفتر "الاعتصام" میں تشریف لائے اور کہا "السلام علیکم۔ میرا نام عبداللہ لائل پوری ہے، حاضر ہو سکتا ہوں؟" میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ وہی مولانا عبداللہ ہیں، جن کا مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی نے ذکر کیا تھا اور "فیض الباری کے دو مقام" کے عنوان سے جن کا مضمون شائع ہوا تھا۔ لمبا قد، سانولا رنگ، متوازن جسم، عمامہ باندھے، تہبند پہنے اور کمبل اوڑھے ہوئے۔ نہ بات چیت میں تکلف، نہ اندازِ کلام میں تصنع، نہ علم کا غرور، نہ تحقیق کا پندار۔ مجھے ان سے مل کر نہایت خوشی ہوئی۔ یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ میرے مہربان اور بزرگ دوست تھے۔ نہ مجھے ان سے کوئی جھجک تھی، نہ انھیں مجھ سے کوئی حجاب ــــ!

شاہ صاحب سے ان کے مراسم ہمیشہ انتہائی مخلصانہ رہے۔ وہ لاہور آتے تو ان سے ملاقات کے لیے ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں تشریف لاتے، مولانا محمد حنیف ندوی سے بہت عقیدت سے ملتے اور مجھ پر شفقت فرماتے۔

شاہ صاحب کے قیام اوکاڑہ کے زمانے میں ان کی ایک صاحب زادی کی شادی ہوئی جس میں مولانا عبداللہ کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ شاہ صاحب شادی میں دف بجانے کے قائل تھے۔ مولانا عبداللہ نے بتایا کہ میں شاہ صاحب کے گھر پہنچا تو ابھی دف بجانے کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ میں گیا تو مجھے دیکھتے ہی شاہ صاحب نے گھر کی عورتوں سے کہا: "اہل حدیث عالم مولانا عبداللہ آگئے ہیں، یہ تمھیں دف بجانے کا حکم دیں گے۔ ان کے حکم کا مطلب دف بجانے کا افتتاح کرنا ہوگا"ــــ مولانا نے فرمایا، شاہ صاحب کی یہ بات سن کر میں مسکرایا اور گھر کی عورتوں سے دف بجانے کو کہا، اور دف بجنے لگی۔

ان کے کتب خانے میں ہر قسم کی علمی اور فنی کتابیں موجود تھیں۔ مولانا محمد حنیف ندوی کو ایک مرتبہ "کتاب سیبویہ" کی ضرورت پڑی جو علم نحو کی مشہور ترین اور اولین کتاب ہے۔ یہ کتاب ان کو کہیں سے نہ ملی۔ مولانا عبداللہ سے ذکر کیا تو فرمایا "میرے پاس موجود ہے، پیش خدمت کر دوں گا"۔ چنانچہ وہ مولانا ندوی کو کتاب سیبویہ دینے کے لیے خود فیصل آباد سے لاہور تشریف لائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک دفعہ مجھے اپنے کام (فقہائے ہند) کے سلسلے میں سمعانی کی "الانساب" کی ضرورت پڑی۔ لاہور میں جہاں تک میری رسائی ہو سکتی تھی، کتاب تلاش کی گئی مگر نہیں ملی۔ اتفاق سے مولانا عبداللہ سے ملاقات ہوئی تو ان سے عرض کیا۔ فرمایا "الانساب" میرے کتب خانے میں موجود ہے، بھجوا دوں گا، چند روز بعد ایک دوست کے ہاتھ کتاب بھجوا دی اور کئی مہینے میرے پاس رہی۔ میں کتاب واپس کرنے فیصل آباد گیا تو فرمایا، اتنی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت تھی، کسی آنے جانے والے کے ہاتھ بھیج دیتے یا میں کبھی خود لاہور جاتا تو لے آتا۔

میرے محترم دوست جعفر قاسمی صاحب کئی سال پیشتر محکمۂ اوقاف پنجاب میں ایک بڑے منصب پر فائز تھے، آج کل اپنے وطن چنیوٹ (ضلع جھنگ) میں سکونت پذیر ہیں، پڑھنا لکھنا اور اہلِ علم سے تعلقات قائم کرنا اور قائم رکھنا ان کا مشغلہ ہے۔ صوفیا و اولیا کے حالات و کوائف سے انھیں بالخصوص دلچسپی ہے۔ انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ چنیوٹ کے گرد و نواح میں [illegible] نہیں، آپ کی نظر میں کسی صوفی مزاج اہلِ علم اور کتابوں کے شوقین عالم کا تمہیں علم ہو تو ان کا پتہ بتاؤ۔ میں نے کہا فیصل آباد میں منٹگمری بازار چلیے۔ وہاں دارالعلوم اثریہ میں مولانا عبداللہ صاحب سے ملیے، وہ آپ کے ذوق و مزاج کے آدمی ہیں، ان کا بہت اچھا کتب خانہ ہے، پڑھنے کے لیے کتابیں بھی دیں گے، کھانا بھی کھلائیں گے، چائے بھی پلائیں گے اور اگر انھیں معلوم ہو گیا کہ محض پڑھنے لکھنے کا شوق آپ کو ان کے ہاں لے جاتا ہے تو آمد و رفت کا کرایہ بھی دیں گے۔ وہ ہر اعتبار سے کھلے دل کے عالم ہیں، آپ انھیں مل کر خوش ہوں گے۔ کہا ان کے نام رقعہ لکھ دو تاکہ ان سے ملنے اور بات کرنے میں کوئی جھجک نہ ہو۔ میں نے کہا رقعے کی ضرورت نہیں، آپ ان کو میرا سلام پہنچا دیجیے اور اپنی ضرورت بیان کیجیے۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد جعفر قاسمی صاحب لاہور تشریف لائے اور بتایا کہ میں عصر کے وقت مولانا عبداللہ کے ہاں پہنچا، وہ حدیث کا درس دے رہے تھے۔ میرے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ دو مالٹے میرے پاس تھے۔ مولانا درس سے فارغ ہوئے تو میں نے اپنے ساتھی کو ایک مالٹا دیا کہ مولانا کی خدمت میں پیش کرو۔ اس نے مولانا کو مالٹا دیا تو انھوں نے غصے سے دور پھینک دیا۔ میں نے اٹھ کر مالٹا پکڑا اور ان کے پاس جا بیٹھا۔ عرض کیا، "مجھے آپ کی خدمت میں اسحاق بھٹی صاحب نے بھیجا ہے اور آپ کو سلام کہا ہے۔" فرمایا، "کون اسحاق بھٹی؟ میں نہیں جانتا۔" عرض کیا، "ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ والے۔" بولے، "میں کسی کو نہیں جانتا۔" میں نے عرض کیا، "حضور ہم مسافر آدمی ہیں، ہماری عرض تو سن لیجیے۔" فرمایا "کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے نہایت نرم لہجے میں چند باتیں کیں تو غصہ جاتا رہا۔ میں نے کہا، "آپ نے مالٹا کیوں پھینک دیا تھا، ہمارا یہ حقیر تحفہ قبول کیوں نہیں فرمایا؟" بولے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"بات یہ ہے کہ بعض لوگ مجھے کیمیاگر سمجھتے ہیں اور اگر اسی قسم کی کوئی چیز پیش کرتے ہیں - میں یہ سمجھا، آپ لوگ بھی اسی لیے میرے پاس آئے ہیں کہ میں کیمیاگر ہوں اور آپ کو سونا چاندی بنانے کا نسخہ بتاؤں۔" یہ سن کر میں ہنس پڑا، وہ بھی ہنس پڑے - پھر بے تکلفی سے باتیں ہونے لگیں - تمھارا سلام قبول کیا اور کہا "اسحاق بھٹی صاحب میرے بہت اچھے دوست ہیں۔" اپنے کتب خانے میں لے گئے، چائے پلائی، کتابیں دکھائیں اور نہایت محبت کا برتاؤ کیا - فرمایا میرے کتب خانے کی جو کتاب آپ لے جانا چاہیں، لے جا سکتے ہیں - جعفر قاسمی صاحب سے ان کا کوئی مسلکی تعلق نہیں تھا، محض علمی تعلق تھا جو آخر وقت تک قائم رہا - قاسمی صاحب نہایت احترام سے ان کا ذکر کرتے تھے - اب بھی وہ ان کی وسعتِ قلب و نظر اور وسعتِ مطالعہ کی تعریف کرتے ہیں -

ایک مرتبہ مجھے اپنے موضوع سے متعلق چند عربی اور فارسی کتابوں کی شدید اور فوری ضرورت تھی - فیصل آباد گیا اور ان کا کتب خانہ دیکھا تو حیران رہ گیا - تفسیر، حدیث، فقہ و اصول، ادبیات، تاریخ، تنقید، رجال و تذکرہ وغیرہ کا وسیع ذخیرہ ان کے ہاں موجود تھا - مجھے برصغیر پاک و ہند کے رجالِ فقہ کے بارے میں جن کتابوں کی تلاش تھی، وہ سب ان کے کتب خانے کی زینت تھیں - فرمایا جو کتاب جی چاہے لے جاؤ اور جب جی چاہے واپس کر دو - کوئی شرط یا پابندی نہیں، اصل چیز تمھاری ضرورت اور مرضی ہے -

یہ ان کی مہربانی اور مجھ پر شفقت کی انتہا تھی - کچھ عرصے بعد ان کی تمام کتابیں جو میں لایا تھا، واپس کر دیں - پنجابی ادب و شعر اور علوم دینیہ سے متعلق بھی بہت سی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں - اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی سنتے جائیے - ایک دن میں ان کی لائبریری میں کتابیں دیکھ رہا تھا کہ ایک موقعے پر میں نے ہیر وارث شاہ کا یہ شعر پڑھا:

جو لئین اڈاریاں نال بازاں اوہ بلبلاں تھک مریندیاں نیں
اوہناں ہرنیاں دی عمر ہو چکی پانی شیر دی جوہ جو پیندیاں نیں

یہ شعر کچھ ایسا برمحل پڑھا گیا تھا کہ سن کر بہت خوش ہوئے - فرمایا، "ہیر سے بھی تعلق رکھتے ہو؟" عرض کیا، "ہیر کتاب سے تعلق رکھتا ہوں۔" اس کے بعد اس موضوع پر مختلف شعرا نے فارسی اور پنجابی وغیرہ میں جو کتابیں تحریر کی ہیں، اس پر گفتگو ہونے لگی - اس اثنا میں انھوں نے بھی ہیر وارث شاہ کا ایک شعر پڑھا - میں نے عرض کیا "ترنم سے!" فرمایا "ٹھیک ہے، ترنم ابھی ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو جائے گا، ذرا دروازہ بند کر دو۔" پھر ہیر کے مختلف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نامات سے چند شعر سناتے ۔ آواز شیریں اور پُرکشش ۔ پڑھنے کا انداز بہت عمدہ اور پیارا ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم بھی مولانا عبداللہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ بعض مسائل میں وہ ان سے استفادہ کرتے اور ان کے کتب خانے سے کتابیں منگواتے تھے ۔ چنانچہ ان کو خطابی کی معالم السنن، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحفۂ اثنا عشریہ اور تفسیر عزیزی کی ضرورت پڑی تو مولانا عبداللہ سے منگوائیں ۔ معالم السنن کے چند مقامات پر مولانا مودودی نے اپنے قلم سے بعض باتیں تحریر بھی کی تھیں ۔ ان دونوں بزرگوں کے درمیان باقاعدہ سلسلہ مکاتبت جاری تھا ۔ مختلف اوقات میں حدیث و فقہ کے بھی اہم معاملات سے متعلق مولانا مودودی ان سے استفسار کرتے تھے ۔ سنن ابی داؤد کی بعض اسناد و متون کے بارے میں بھی مولانا مودودی نے ان سے کچھ سوالات کیے تھے اور انھوں نے تمام سوالوں کا وضاحت سے جواب دیا تھا ۔

مولانا عبداللہ مرحوم علم و فضل کے ساتھ ساتھ بہت نیک اور پرہیزگار بھی تھے ۔ نماز تنہا پڑھتے یا امامت کراتے، زیادہ لمبی نہیں پڑھتے تھے، تاہم نہایت خشوع و خضوع سے نماز ادا فرماتے اور مقتدی ان کی اقتدا میں ایک خاص قلبی کیفیت محسوس کرتے ۔ غالباً ۱۹۵۳ کی بات ہے، وہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام (شیش محل روڈ، لاہور) تشریف لائے ۔ نماز کا وقت ہوا تو کسی صاحب نے انھیں نماز پڑھانے کے لیے کہا ۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی کہ مولانا سید داؤد غزنوی مرحوم تشریف لے آئے ۔ اس وقت مولانا غزنوی ان کو نہیں جانتے تھے ۔ نماز کے بعد مولانا غزنوی وظیفے سے فارغ ہوئے تو کسی سے پوچھا، "یہ کون صاحب ہیں؟ بہت نیک آدمی ہیں ۔" انھیں مولانا سے ملایا اور تعارف کرایا گیا ۔ مولانا نے ان کو دعا دی اور فرمایا "آپ کی اقتدا میں نماز پڑھ کر مجھے ایک خاص سرور حاصل ہوا ۔" اس کے بعد دونوں کے درمیان بہت اچھے مراسم قائم ہو گئے تھے ۔ مولانا غزنوی انھیں اکثر دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں اختتام صحیح بخاری کی تقریب میں آخری حدیث پر تقریر کرنے کے لیے دعوت دیتے ۔

ایک مرتبہ حج کے موقعے پر حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب (گولڑہ) کے جانشین حضرت پیر غلام محی الدین کو (جنھیں لوگ پیار سے باؤ جی کہتے تھے) مولانا عبداللہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا ۔ نماز میں ان پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ تعارف کے بعد اصرار کیا کہ قیام مکہ مکرمہ کے دوران مولانا انھی کے ہاں قیام فرمائیں ۔ مولانا نے معذرت کی مگر پیر صاحب نے قبول نہیں فرمائی ۔ چنانچہ وہ کئی دن پیر صاحب کے پاس مقیم رہے ۔ پیر صاحب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اپنے باورچی کو خاص طور سے ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کا کھانا ان کی پسند کے مطابق تیار کیا جائے۔ جماعت کے وقت اگر مولانا موجود ہوتے تو پیر صاحب انھی کو امام بناتے اور ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے۔ اس اثنا میں پیر صاحب نے [illegible] کو یہ عجیب واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (متوفی ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری (متوفی ۱۶ مارچ ۱۹۴۸ء) حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب (متوفی ۲۹ صفر ۱۳۵۶ھ / ۱۱ مئی ۱۹۳۷ء) سے ملاقات کے لیے گولڑہ تشریف لے گئے۔ نماز کا وقت ہوا تو حضرت پیر صاحب نے امامت کے لیے مولانا محمد ابراہیم صاحب کو آگے کر دیا۔ اس سے ان کے بعض مرید اور معتقد کچھ پریشان سے ہوئے، پیر صاحب نے فرمایا: "جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی نماز مولانا ابراہیم کے پیچھے نہیں ہوتی، وہ الگ جا کر نماز پڑھ لے۔ ہم مولانا کی اقتدا ہی میں نماز پڑھیں گے۔"

یہ پرانے زمانے کے متوازن اور معتدل اہلِ علم کی باتیں ہیں۔ اس دورِ ہنگامہ خیز میں ان کو صحیح سمجھنے والے بھی بہت کم لوگ ملیں گے۔

مولانا عبداللہ بے شک ایک خاص فقہی مسلک کے حامل تھے، لیکن ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ہر فقہی مکتبِ فکر کے حضرات سے ان کے مراسم اور روابط تھے۔ فیصل آباد کے قریب سالار والا میں ایک بزرگ پیر ابوانیس محمد برکت علی فرد کش ہیں، ان کے مولانا سے گہرے مراسم تھے۔ مولانا ان کے ہاں جاتے اور وہ مولانا کے ہاں آتے تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی تو مولانا نے اس کی تخریج کی۔

وہ بہت وسیع النظر اور فراخ حوصلہ عالم تھے۔ جو شخص جتنی مشکل بات پوچھتا، اتنا ہی خوش ہوتے۔ اس حیثیت سے کہنا چاہیے کہ وہ مشکل پسند تھے اور سوال میں جس قدر سنگلاخ زمین اختیار کی جاتی، اسی قدر مسرت محسوس کرتے۔ ہمارے ایک محترم اور بزرگ دوست سید شیر محمد مشکل سوال کرنے کے عادی ہیں۔ ایک مرتبہ وہ یہ تحقیق کر رہے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا اسم گرامی کیا ہے اور حدیث کی کس کس کتاب میں کس انداز میں بیان ہوا ہے۔ میں نے مولانا عبداللہ مرحوم کو خط لکھا۔ انھوں نے فوراً جواب دیا اور مسند امام احمد کی چھ سات احادیث درج کر دیں کہ حضرت موسیٰ کے والد کا نام نامی عمران تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں فلاں مقام پر اس انداز سے ان کا ذکر فرمایا ہے۔ خط کے آخر میں تحریر فرمایا، تمھارے خط کا فوراً جواب دے رہا ہوں اور جلدی میں جو حدیثیں مل سکی ہیں، درج کر دی گئی ہیں، ولعل عندنا مزید۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے دن پھر خط آگیا۔ اس میں مزید حیثیتیں اور حوالے تھے تیسرے دن پھر آگیا، اس میں بھی حدیث کی بعض کتابوں کے حوالے مرقوم تھے۔

اس سے چند روز بعد لاہور میں ایک دوست کے ہاں شادی میں ملاقات ہوئی۔ فرمایا، بعد میں تم نے کوئی سوال نہ پوچھا۔ مشکل سے مشکل سوال پوچھا کرو اور ضرور پوچھا کرو۔ مجھے مشکل سوال ہی سے لطف آتا ہے، جب تک ذہن پر بوجھ نہ پڑے اور کتابیں نہ کھنگالی جائیں، بات نہیں بنتی۔ فرمایا، ایک مرتبہ ایک شخص نے خط کے ذریعے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ کا نام دریافت کیا۔ میں نے کہا... آپ پھنس گئے۔ بالآخر یہ مسئلہ سیوطی نے حل کر دیا اور مجھے بہت خوشی ہوئی۔

وہ عادات و اطوار کے اعتبار سے ملنگ اور قلندر آدمی تھے۔ ہر شخص سے محبت اور پیار سے ملتے۔ ہر قسم کے لوگوں سے ان کے مراسم تھے اور سب ان کا احترام کرتے تھے۔ میں انھیں کہا کرتا تھا کہ آپ "سلسلۂ محبتیہ" یا "سلسلۂ الفتیہ" قائم کر لیجیے اور ایسے لوگوں کو اس میں شامل کیجیے جو سب سے محبت و الفت کا برتاؤ کریں۔ میں اس سلسلے میں شامل ہونے والا پہلا شخص ہوں گا جو آپ کے دستِ پُرشفقت پر بیعت کروں گا۔ اس دنیا میں ہر شے کی فراوانی ہے، لیکن محبت مفقود ہے۔ "سلسلۂ محبتیہ" میں شامل ہو کر ہم لوگوں کو پیار کا درس دیں گے اور دنیا میں محبت کے ذریعے امن و امان قائم کریں گے۔ نہ کسی کا کوئی دشمن ہوگا اور نہ لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچے گی۔ ہر طرف امن ہی امن اور سکون ہی سکون ہوگا۔

مولانا مرحوم تعویذ بھی لکھتے تھے اور دم جھاڑا بھی کرتے تھے۔ لوگوں کو ان پر یقین تھا اور ان کے تعویذ، دم اور دعا وغیرہ کو اللہ شرفِ قبولیت عطا فرماتا تھا۔

مختلف فقہی مسائل سے متعلق بے شمار لوگ ان سے فتوے پوچھتے تھے اور وہ نہایت مدلل فتوی لکھتے تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ کی رو سے مسئلۂ زیرِ بحث کے ہر پہلو کی وضاحت کرتے۔ اگر ان کے فتوے جمع کیے جائیں تو یہ بڑی خدمت ہوگی جو ان کے قائم مقام مولانا ارشاد الحق اثری کو انجام دینی چاہیے۔

ان کی خدماتِ گوناگوں میں ادارہ علوم اثریہ کو خاص اہمیت حاصل ہے جو فیصل آباد میں قائم ہے، وہ اس کے بانیوں میں سے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی اور ان سطور کے راقم کا شمار بھی مؤسسینِ ادارہ میں ہوتا ہے۔ پہلے اس ادارے کی باقاعدہ میٹنگیں ہوتی تھیں اور ہم لوگ ان میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا ندوی صاحب تو ادارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بن تدریس کے لیے بھی لاہور سے فیصل آباد جاتے تھے۔ اب عرصے سے کوئی میٹنگ نہیں ہوئی۔ مولانا عبداللہ نے اپنا تمام
لتب خانہ ادارے کو دے دیا تھا اور وہ اس میں شیخ الحدیث بھی تھے۔ ادارہ علوم اثریہ کے لیے انھوں نے بہت
محنت کی اور انتہائی ایثار کا مظاہرہ کیا۔

وہ بڑے ہی صابر و شاکر آدمی تھے۔ گیارہ بارہ سال پہلے جوان بیٹا فوت ہوا، پھر بیوی نے وفات پائی۔ یہ دو
بہت بڑے صدمے تھے، جو انھوں نے نہایت صبر سے برداشت کیے۔ میں دونوں کے جنازے میں شامل ہوا اور دونوں
دفعہ فرمایا کہ لاہور سے فیصل آباد آئے ہو، اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہیں بیٹھ کر دعا کر دینا کافی تھا۔

کتابیں خریدنا اور پڑھنا ان کا اصل مشغلہ تھا۔ ان کے مطلب کی جو کتاب کہیں چھپتی اور ان کے علم میں آجاتی
سے خریدنے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور اس وقت تک چین نہ لیتے جب تک اسے خرید نہ لیتے اور پوری کتاب
پڑھ نہ لیتے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، جس میں پڑھے لکھے، ان پڑھ، امیر غریب سب شامل تھے۔ وہ ان
سے ملتے بھی تھے، باتیں بھی بہت کرتے تھے، ان کے کام بھی کراتے تھے اور مطالعہ بھی کرتے تھے۔ اپنی لائبریری میں
جاتے تو کتابوں میں غرق ہو جاتے۔ کتابیں ان کے لیے قبر بنی ہوئی تھیں۔ لکھتے بہت کم تھے۔ ان کا بہت بڑا کام مسند
ابویعلی کی تحقیق و تصحیح ہے۔ اس میں مسند عثمان نہیں ہے، اس کے مختلف قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر مسند عثمان
مرتب کی۔

وہ بہت اونچے آدمی تھے۔ دل تعصب سے خالی اور ذہن بغض و عناد سے پاک۔ سب سے دوستی اور سب کے
خیر خواہ۔ متقی و پرہیزگار، پیکر سخاوت، مہمان نواز، بلند اخلاق، منجھے ہوئے مدرس، جلیل القدر عالم اور چلتا پھرتا
کتب خانہ۔ مختلف مسائل سے متعلق بہت سی کتابوں کے حوالے ان کے ذہن میں محفوظ تھے۔ اس رعایت سے میں
انھیں "حوالدار" کہا کرتا تھا۔ ان کی موجودگی میں کوئی صاحب مجھ سے علمی گفتگو کرتے تو میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے
فرماتے، "وہ حوالے سے بات کرو، گھبرانے کی ضرورت نہیں، حوالدار مدد کے لیے موجود ہے۔"

مولانا مرحوم علم کے میدان میں تحمل و بردباری کے اعتبار سے ہماری قدیم روایات کے امین تھے۔ اللہ انھیں کروٹ
کروٹ جنت نصیب کرے۔

حضرت مرحوم ۱۰ اپریل ۱۹۸۳ کو یعنی ۱۴۰۳ھ کے رمضان المبارک سے قبل اپنے مسکن فیصل آباد سے حجاز مقدس
کے لیے روانہ ہوئے۔ چند روز کراچی ٹھہرے۔ پھر مکہ مکرمہ گئے۔ رمضان کا مہینہ وہیں گزرا۔ جدہ میں ان کے بعض عزیز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں وہ جاتے تھے نئے سند البویعلی سے ... وہاں سکھائے گئے تھے۔ عید الفطر کے بعد ... اپنے بیٹے جدہ آئے۔ ۴ جولائی کو جمعرات کے روز جدہ سے مکہ معظمہ کو روانہ ہوگیا اور عمرے کے لیے احرام باندھا۔ لیکن اچانک دل میں درد ہونے لگا۔ احرام کھول دیا اور واپسی کا ارادہ دوسرے دن جمعۃ المبارک پر ملتوی کر دیا، مگر دوسرے دن یعنی ۵ جولائی ۱۹۸۳ (۲۴ شوال ۱۴۰۳ھ) کو جمعے کے روز نمازِ عصر کے بعد دل کا ایسا شدید دورہ پڑا کہ طبی امداد پہنچنے سے قبل روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مولانا نے ۷۹ سال عمر پائی۔

اس عاشقِ رسول اور شیدائے سنتِ خیر البشر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی میت کو جدے سے مکہ مکرمہ لے جایا گیا اور اس کی خاکِ پاک میں دفن کر دیا گیا۔

اللہم اغفر لہ و ارحمہ و عافہ و اعف عنہ

© rasailojaraid.com